تحریر: ڈاکٹر داؤد رہبر

تلخیص: احمد حاطب صدیقی

مسیحی اور اسلامی ثقافتوں کے روحانی عناصر

[ڈاکٹر داؤد رہبر (۶ اپریل ۱۹۲۷ء---)، مرحوم پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال کے صاحبزادے ہیں۔ پروفیسر محمد اقبال معروف مستشرق ایڈورڈ - جی - براؤن کے نامور شاگرد اور اورینٹل کالج (پنجاب یونیورسٹی) کے ابتداءً استاد اور بعد ازاں پرنسپل رہے۔

ڈاکٹر رہبر نے پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں ایم - اے کیا۔ (۱۹۴۷ء) اُسی سال اورینٹل کالج لاہور میں لیکچرار ہو گئے۔ دو سال بعد کیمبرج گئے اور ۱۹۵۳ء میں وہاں سے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ اس کے بعد شعبۂ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی سے منسلک ہوئے۔ (۱۹۵۳ء - ۱۹۵۴ء) بعد ازاں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز - میک گِل یونیورسٹی - مانٹریال سے بطور سینیئر فیلو وابستہ ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے انقرہ یونیورسٹی (ترکی) میں شعبۂ اُردو و پاکستانیات کی داغ بیل ڈالنے کے لیے بھیجے گئے۔ ستمبر ۱۹۵۹ء تک وہاں رہے۔ پھر ہارٹ فورڈ سیمنری سے بطور مہمان استاد وابستہ ہوئے۔ آخری زمانۂ ملازمت میں ہوسٹن یونیورسٹی سے منسلک تھے۔ ان دنوں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔

ڈاکٹر داؤد رہبر سے متعدد کتابیں یادگار ہیں۔ اِن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

* ترجمہ Persian Literature Under Tatar Dominion، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان (۱۹۴۹ء)

* نسخہ ہائے وفا، لاہور: پنجاب اکادمی (۱۹۵۹ء)

* God of Justice، لائیڈن: ای - جے - برل (۱۹۶۰ء)

دو اڑھائی برس بیشتر سہ ماہی "نیا دور" (کراچی) نے اُن کا ایک سلسلۂ مضامین "کلچر کے روحانی عناصر" کے زیرِ عنوان شائع کیا۔ اِس سلسلۂ مضامین میں ہندو، چینی، مسیحی، اسلامی اور بدھ مت کے پیدا کردہ کلچروں پر گفتگو کی گئی ہے۔ ذیل میں "عالم اسلام اور عیسائیت" کے قارئین کی دلچسپی کے لیے سہ ماہی "نیا دور" کے شکریے کے ساتھ مسیحی اور اسلامی کلچروں کے روحانی عناصر پر ڈاکٹر داؤد رہبر کے مضامین کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ مدیر]

— ۱ —

مسیحی ثقافت کے روحانی عناصر

قرآن کی طرح بائبل بھی ایک ایسی سربمہر مقدّس کتاب ہے جس کی عبارتوں میں ردّو بدل کو روکنے کے لیے آیات کے اعداد و شمار ڈالے گئے۔ آیات کی ترتیب بدلنا کسی طرح جائز نہیں۔ بائبل کی آیات عقائد کا ماخذ بنیں۔ بائبل اور قرآن دونوں ہی میں ایمان و یقین کی دعوت اور تعلیم دی گئی ہے۔

بائبل کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ جو ضخیم تر ہے، عہدِ عتیق کہلاتا ہے۔ یہ حصّہ تمام تر عبرانی زبان میں تھا، دوسرا حصّہ جو عہدِ جدید کے نام سے موسوم ہوا، پہلے پہل یونانی زبان میں قلمبند کیا گیا۔ عہدِ عتیق سے مراد وہ پیمانِ قدیم ہے جو خدا نے اوّلاً حضرت نوح علیہ السلام سے کیا، پھر وقتاً فوقتاً مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانوں میں اس عہد کی تجدید ہوتی رہی۔ عہد عتیق پر یہودی اور مسیحی دونوں ایمان رکھتے ہیں جبکہ عہد جدید یہودیوں کے لیے قابل قبول نہیں، اس پر صرف مسیحی ایمان لاتے ہیں۔

عہدِ عتیق

عہدِ عتیق میں اس کائنات کی ابتداء کا بیان ہے، خدا اور انسان کے تعلق کا ذکر ہے۔ آدم و حوّا کا قصّہ ہے۔ دینی عقاید کی تعلیم اور عذاب و ثواب کے قصّے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام)، اُن کی اولاد یعنی بنی اسرائیل اور انبیائے بنی اسرائیل کی داستانیں ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کی تفصیلات ہیں اور آپ علیہ السلام کو دیئے جانے والے احکام شریعت کا ذکر ہے۔ فرعون کی غلامی اور اس غلامی سے نجات کی تفاصیل ہیں۔ بنی اسرائیل کی خانہ بدوشی کی تاریخ اور پیمان مقدّس (توراۃ) کی حفاظت اور احترام کے لیے تعمیر کی جانے والی مقدّس ڈولی کو لیے لیے پھرنے کے حالات مذکور ہیں۔ بنی اسرائیل کی اپنی بادشاہت قائم ہونے سے لے کر ان کے دوبارہ غلام بننے اور اس غلامی سے نجات پانے سے لے کر یروشلم کے رومن سلطنت کا حصّہ بن جانے تک کے تذکرے ہیں۔

عہدِ جدید

عہد عتیق سراسر محض بنی اسرائیل سے تھا۔ عہدِ جدید یہ ہے کہ خدا نے مصلوب ہو کر اپنے قاتلوں کا گناہ ان کے استغفار کے بغیر ہی بخش دیا۔ اس عفوِ خاص سے ظالموں کے دل نرم پڑ گئے۔ یعنی

جب بخشش ہو گئی تب توبہ کی توفیق ملی۔ گویا توبہ سے بخشش نہیں ہوئی، بخشش سے توبہ ممکن ہوئی۔

مسیحیوں کے نزدیک زمانۂ قبل از مسیح، عہد عتیق (یا پیمان قدیم) کا زمانہ ہے اور تصلیب مسیح ہی عہد جدید (یا پیمان نو) کا نقطہ آغاز ہے۔

حضرت عیسیٰ کے ظہور نے تاریخ انسانی کو قبل از مسیح اور بعد از مسیح (یا عیسوی) ادوار میں منقسم کر دیا۔ میلاد مسیح تاریخ انسانی کا ایک ایسا سنگِ میل ہے کہ مؤرخوں نے اسے تاریخ شماری کے لیے ایک حوالہ بنا لیا ہے۔

حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام نے (جنہیں مسیحی "یسوع مسیح" کہہ کر پکارنا پسند کرتے ہیں) بنی اسرائیل کے مذہب کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا اور ایک نئے دین کے داعی ہوئے۔ یسوع مسیح کو مسیحیوں کے یہاں پیغمبر نہیں، خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔ اور خدا کے اوتار (یعنی خود خدا) کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے کہ صیغۂ واحد ہی کا استعمال خدائے واحد کے لیے واجب ہے۔ یسوع کا مصلوب ہونا مسیحی عقیدے میں خدا کا مصلوب ہونا ہے۔ یسوع نے اپنے خطبات میں خدا کو آسمانی باپ کے نام سے یاد کر کے ثابت کر دیا کہ خدا سے اس کا رشتہ فرزندانہ ہے۔ خود یسوع جو آسمانی باپ کا فرزند کہلایا تو اس کی قرین قیاس وجہ یہی ہے کہ یسوع کی افتاد طبع بھی فرزندانہ تھی، پدرانہ اور بزرگانہ نہ تھی۔ یسوع سے قبل قوم بنی اسرائیل ایک ایسے روحانی و دُنیوی نجات دہندہ یعنی ایک معرکہ آرا مسیح کے انتظار میں تھی جو یروشلم کو رومن تسلط سے آزاد کرائے گا۔ جب یسوع کی گفتگو میں ان کو اس کے مسیح ہونے کا دعویٰ ملا تو یسوع کی طرف توجہ بڑھتی گئی اور علمائے یہود مشتعل ہونے لگے۔

مسیحی یہ کہتے ہیں کہ یسوع از روئے نسب یہودی ہی تھا، کیونکہ اس کے اجداد بنی اسرائیل میں سے تھے، جبکہ یہودی صدہا سال تک یہی کہتے رہے کہ یسوع کا قصہ من گھڑت ہے۔ ایسا کوئی شخص بنی اسرائیل میں پیدا ہی نہیں ہوا، مگر اب ہمارے زمانے کے بعض روشن خیال اور صلح جُو یہودیوں نے مصلحت بینی سے کام لے کر اس حد تک سمجھوتہ کر لیا ہے کہ یسوع کوئی فرضی شخص نہیں، ایک پیغمبر تھا، لیکن مسیحی اسے بھی ایک توہین آمیز قول سمجھتے ہیں، کیونکہ یسوع ان کے نزدیک پیغمبر نہیں، خدا کا اوتار بلکہ خدا ہے۔

یسوع کی تعلیمات میں دینِ موسوی سے جو تفاوت اور اختلاف تھا، اُسے توراۃ کے محافظ برداشت نہ کر سکے۔ یسوع کی تعلیمات کا خلاصہ آنولوں والی پہاڑی کے وعظ میں پورے نچوڑ کے ساتھ ملتا ہے، جس سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے عہد عتیق اور یسوع کے عہد جدید میں کتنا تفاوت ہے۔ مؤرخین کی تحقیق ہے کہ اس وعظ کی اٹھان جن اقوال سے ہوئی ہے وہ خانقاہ قُمران کی برادری کے اوراد و وظایف سے ہم آہنگ ہیں، اور یسوع کا اس برادری سے میل جول تھا۔ اس وعظ نے ضمیر انسانی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک ہی وعظ میں اتنی باتیں کہہ جانے کی صلاحیت برسوں کی ریاضتوں اور مراقبوں

کے بغیر ممکن نہیں۔ آنولوں والی پہاڑی کا وعظ متّی کی انجیل کے ابواب ۵ تا ۷ پر محیط ہے۔ یسوع کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے اس وعظ کا مطالعہ ازحد ضروری ہے۔

یسوع کے عمل اور گفتار دونوں میں ایک للکار ہے۔ پہاڑی کے وعظ سے ثابت ہوا کہ یسوع کی تعلیم توراۃ کی تعلیم سے اعراض کرتی ہے۔ مثلاً یسوع کی یہ تعلیم کہ سبت کے دن کارِ خیر سے رُکے رہنا کوئی خوبی نہیں اور پاکیزگی کا انحصار حلال و حرام، مشروبات اور غذاؤں پر نہیں بلکہ صفائے باطن پر ہے۔ برافروختہ یہودی علماء یسوع کی شکایت لے کر رومن گورنر پیلاطُس کے پاس گئے۔ پہلے تو اس نے یہ کوشش کی کہ یسوع کا مقدمہ یہودی خود نمٹالیں، مگر جب اُسے کوئی راستہ نہ ملا تو بالآخر اسی کو یسوع کو سولی دینے کا حکم صادر کرنا پڑا۔

یسوع کی میّت جب صلیب سے اتار کر قبر میں رکھی گئی تو اس کے تیسرے روز اس کے اقارب نے اسے وہاں موجود نہ پایا۔ اس کے بعد جلد ہی یسوع نے اپنے حواریوں کو بالمشافہ دیدار دے کر اپنے زندہ ہونے کا یقین دلایا اور انہیں اپنے معراج کا مژدہ سنایا۔ اس دیدار سے یسوع پر ایمان لانے والوں کو دلاسا ملا اور انہیں یقین آگیا کہ الحی القیوم آسمانی باپ کا فرزند بھی الحی القیوم ہے۔ اس کو کوئی مار سکا، نہ مار سکے گا۔ یسوع کو خدا مان لینے کی وجہ یہی تھی۔ آج بھی جو لوگ اس کو سچّا خدا مانتے ہیں، اسی وجہ سے مانتے ہیں۔ یسوع کی معراج مسیحی عقیدے میں سقوطِ آدم کی بدبختی کا الٹ ہے۔

صلیب پر موت کے تیسرے روز یہ شہید یزدانی زندہ ہو کر معراج یاب ہوا۔ جب یسوع اپنے آسمانی باپ سے جا ملنے کو سوئے فلک روانہ ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک نورانی لکۂ ابرِ قدسی ظاہر ہوا اور یسوع اس کی لپیٹ میں آکر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

چند روز بعد بارہ افراد جمع ہوئے اور انہوں نے عہد کیا کہ وہ یسوع کی تعلیمات، شہادت بشارت اور معراج کا چرچا کریں گے۔ یہ مبلّغین جو یسوع کے ساتھی تھے رسول کہلائے۔ اسلامی زبانوں کی طرح مسیحی محاورے میں رسول اور نبی مترادف نہیں، بلکہ رسول کا لفظ یسوع کی بشارت پھیلانے والے اُن کے ساتھیوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

ان مبلّغین کو ابتداء میں شدید مخالفتوں اور اذیّتوں کا سامنا کرنا پڑا، انہی میں ممتاز حواری پطرس اور مبلّغ ساؤل بھی تھا جو آج سینٹ پال کے نام سے مشہور ہے۔ مبلّغ ساؤل (سینٹ پال) نے یونان کے شہر ایتھنز اور کرنتھ میں تقریریں کیں، اور تبلیغ کے سلسلہ میں نوایمان مسیحیوں کو خطوط لکھے، ان میں سے بعض خطوط عہد نامہ جدید میں شامل ہوئے۔

ساڑھے تین سو سال کی دشواریوں کے بعد مسیحی ملّت کو رومن امداد میسّر آئی مگر دنیا کی طاقت ور ترین ملّت بن جانے کے بعد بھی، آغاز کی داستانِ مظلومی کے باعث مسیحیوں کے شعور میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ ہم مسیحی مظلوم لوگ ہیں، چنانچہ مظلومی سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جاتی رہتی ہیں۔ یہی

وجہ ہے کہ مسیحی ملّت ایک چوکس اور بیدار ملّت ہے جو اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کی تیاری میں کمی نہیں آنے دیتی۔

مسیحی ملّت میں عقاید کا اختلاف

مسیحی ملّت میں دوسری ملّتوں کی طرح عقاید کا اختلاف ہوا۔ مسیحی عقیدے کے مطابق پدر اور فرزند میں مکمل ایکا ہے، دوئی کا شائبہ تک نہیں، چنانچہ پدر سے دعا کریں یا فرزند سے، ایک ہی بات ہے۔ روح القدس کی حمد بیک وقت پدر و فرزند کی حمد بھی ہے۔ باپ، بیٹا اور روح القدس تین ہو کر بھی ایک ہیں۔ مسیحی عقیدے کو محض تثلیث کہنے سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ "تثلیثی توحید" ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں ایک قول سنا گیا کہ مسیح خدا کا اوتار تو تھا لیکن اس کی بشری تجسیم ایک نظری دھوکا تھی۔ اس کا صلیب پر اذیت سہنا بھی واقعہ نہیں۔ لوگوں کو یوں محسوس ہوا کہ اس پر یہ گزری۔ یا پھر یوں ہوا کہ کوئی اور شخص مصلوب ہوا اور لوگ سمجھے کہ مسیح کو سولی دی گئی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قول سب سے پہلے کس کی زبان پر آیا؟ اس قول کا ابطال پہلی صدی میں اِگنے شی اس اور دوسری صدی میں آئی رے نی اس اور ٹرٹلین نے کیا۔

مون ٹے نی اَس کا دعویٰ نبوّت

مسیحی عقیدے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ یوحنا نبی کے بعد (جو یسوع کا معاصر تھا) پیغمبروں کا آنا بند ہو گیا، اس لیے مسیحی ملّت میں یسوع کے زمانے کے بعد پیغمبری کا دعویٰ ممنوع قرار پایا۔ دوسری صدی میں ایک نو مسیحی "مون ٹے نی اَس" نے ملک فرجیا میں آ کر نبوّت کا دعویٰ کیا۔ دو عورتیں پرسلاد اور میکسی ملا اس کی شریک نبوت ہوئیں۔ تینوں نے مل کر اپنی پیغمبری کے چرچے کیے۔ چھٹی صدی تک اس فرقے کے ماننے والے ایشیائے کوچک کے علاقوں میں موجود تھے۔ اس کے بعد کم ہوتے چلے گئے اور نویں صدی تک اس فرقے کا خاتمہ ہو گیا۔ مون ٹے نی اس کے عقائد میں تجرّد، شہادت کی موت اور ریاضتوں پر زور دیا گیا تھا۔ مسیح کے ظہورِ ثانی کا انتظار بھی اس کی تعلیمات میں شامل تھا۔ کیتھولک حلقوں نے اس کی زبردست مخالفت کی۔

اور جِن کے اقوال

تیسری صدی میں اسکندریہ کے ایک صاحبِ اجتہاد اور جن (Origen) نے یہ تصوّر پیش کیا کہ موجودات میں اسفل سطح تک گرے ہوئے انسانوں کو پستی سے بچانے والی ارواح کی ایک کائناتی تنظیم ہے۔ اور ان میں خاص الخاص نجات دہندہ مسیح کی روح ہے۔ اسکندریہ ہی کے ایک منتظم ایتھے نی اس نے

چوتھی صدی میں اور جن کے اقوال میں شرک کے رجحان کو روکنے کے لیے اس قول کا اضافہ کیا کہ آفرینش کے سارے سلسلے کا مقصود خدا کے اوتار مسیح کا ظہور ہے اور نجات دہندہ صرف مسیح ہے۔ اور جن کی زندگی ہی میں اس کے اقوال کی زبردست مخالفت ہوئی اور ۵۵۳ء میں قسطنطنیہ کی مسیحی کونسل نے اس کے عقاید کی مذمّت کی قرارداد منظور کی۔

آری نی اُس کے اقوال

۱۔ خدا یکتا ہے اور مولود نہیں، اور ماسوا کی تخلیق خدا کی مشیّت سے ہوئی۔ تخلیق سے پہلے خدا کے سوا کچھ موجود نہ تھا۔

۲۔ لوحِ محفوظ کا کلمہ جس کا دوسرا نام مسیح ہے، کائنات اور خدا کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہے لیکن ازلی نہیں، یعنی ایک وقت وہ بھی تھا جب یہ کلمہ موجود نہ تھا۔

۳۔ الکلمہ یعنی مسیح مخلوق ہے۔

۴۔ مسیح خدا کا فرزند اس بناء پر ہے کہ وہ خدا کا متبنّیٰ ہے۔

۵۔ کلمۂ مجسم یعنی مسیح خدا سے کم تر درجہ پر ہے لیکن لائقِ عبادت ہے۔ اور باقی تمام مخلوق سے برتر ہے اور اس کا حاکم ہے اور کھوئی ہوئی جنّت ہمیں واپس دلانے والا وہی ہے۔

نائی سین کی کونسل کے اجلاس (۳۲۵ء) میں آری نی اس کے ان اقوال کا ابطال کیا گیا، اور ان کے جواب میں خدا اور اس کے فرزند کے متحد الذّات ہونے کا اثبات کیا گیا۔ آری نی اس کے اقوال کو رد کرنے میں ایتھے نی اُس کی مستعدی بھی مشہور ہے۔

ڈوناٹس کا قول

چوتھی اور پانچویں صدی میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ دین سے متعلق رسموں کی صدارت پر مامور پادری کے دفترِ اعمال کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اس مسئلہ پر رومن شہنشاہ کانس ٹن ٹائن کے فرمان سے تین کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ تینوں نے ڈوناٹس کے خلاف، جو ان اقوال کا پرجوش مبلّغ تھا، فیصلہ دیا۔ جن پادریوں پر یہ تہمتیں لگائی گئی تھیں ان میں سے کوئی بھی برطرف نہیں کیا گیا۔ ڈوناٹس اپنی رائے پر مصر رہا۔ شہنشاہ نے اس کے حمایتیوں کو جلاوطن کیا اور یہ تحریک شمالی افریقہ جا پہنچی جہاں ایک صدی تک اس کے اثرات قائم رہے۔ سینٹ آگسٹائن نے اس کا رد مرتب کیا۔

پیلے جی اس کا قول

پیلے جی اس ایک انگریز راہب تھا۔ ایک مدّت تک روم میں مقیم رہا پھر افریقہ جا پہنچا۔ اس کا کہنا

تھا کہ آدم کے عصیاں کا اثر بنی آدم پر ضرور ہوا اور علاج کی ضرورت پیش آئی۔ یسوع کے قول اور عمل سے علاج میسر آیا۔ لیکن پیلے جی اس یہ بھی کہتا ہے کہ تقصیر آدم کے باوجود بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن کو علاج کی چنداں ضرورت نہیں، اور وہ بغیر چارہ گری کے اچھے خاصے بھلے مانس ہیں۔ سینٹ آگسٹائن نے اس عقیدے پر نکتہ چینی کی اور یہ دلیل دی کہ ایسا سوچنے سے آدم کا عصیان اتنا چھوٹا لگنے لگتا ہے، گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ دوسرے اس سے مسیح کی نجات دہندگی کی شان کی بھی تخفیف ہوتی ہے۔

پروٹسٹنٹ تحریک

سولھویں صدی میں اصلاح دین کی تحریک سے احتجاجی (پروٹسٹنٹ) مسیحیت کا ظہور ہوا۔ "فاسد عقاید" کا رفع کرنا اس کا نصب العین تھا۔ پروٹسٹنٹ رہنماؤں کا سب سے بڑا اعتراض گرجا کے پھیلائے ہوئے اس عقیدے پر تھا کہ گناہگار اپنے گناہوں کی معافی، فیس ادا کر کے، خرید سکتے ہیں۔ گرجا گھروں کا یہ کاروبار پاپایانِ روم کی رضامندی سے جاری تھا۔ اس سے بڑا احتجاج گرجا کے عہدیداروں کے اقتدار اور تکبر کے خلاف اٹھا۔ یورپ بھر میں یہ نعرہ بلند ہوا کہ گرجا خدا اور بندے کے تعلق میں دخل انداز بلکہ خلل انداز ہے۔ اس تحریک سے عوام کو عقاید کی بحث کی آزادی ملی اور گرجا گھر کی رکھوالی میں عوام کو پادریوں کے ساتھ شرکت کا موقع مل گیا، یوں جمہوریت نے جنم لیا۔

آج کے مسیحیوں کی نظر میں یروشلم ہی مقدس نہیں، روم کو بھی تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا ہے کہ پاپاؤں کی گدی وہیں ہے۔ گزشتہ چھ سات سو برسوں میں قدیم تہذیب کے گھواروں میں سے ایک تیسرا عظیم شہر یعنی ایتھنز بھی مسیحی تہذیب کا منبع بن گیا۔ یونانیوں کی تکثیر پرستی، رنگینیاں، شہوت رانیاں اور ان کی اصنام گری بھی مسیحی تہذیب پر اثر انداز ہوئی۔ بائبل میں توحید پر جو اصرار ہے، اس سے گھٹن محسوس ہونے لگی اور لذات جسمانی سے پرہیز کا جو سبق بائبل نے دیا ہے، اس کی بہ نسبت حسن پر فریفتہ ہو جانے والے خداؤں کی کہانیوں میں زیادہ لطف آنے لگا۔ مسیحی تہذیب پر بالخصوص یونانی تھیٹر کا فن چھا گیا۔ مسلمان بھی یونانی فلسفہ سے متاثر ہوئے مگر انہوں نے اسٹیج کا فن اخذ نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ محسوس ہوتی ہے کہ مسیحی عقائد میں خدا کے تین روپ ہیں۔ تو جس خدا کے تین روپ ہوں اس میں گویا ایکٹر والی صفات ہیں۔ رویت اللہ کے عقیدے کا تصور اسلامی (اور یہودی) تہذیب میں کفر قرار پایا۔ پس جو خدا اسٹیج پر نہ آیا، اس کی پرستش کرنے والوں میں اسٹیج پر مختلف روپ دھار کر آنے کی امنگ نہ ہوگی۔ اپنی اصلی صورت کو ڈھانک کر کسی اور کا روپ دھارنا اسلامی کلچر کے منافی ہے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت برملا سیرت ہے۔ اس کی چھاپ اسلامی کلچر پر یوں ہے کہ ایک مہذب مسلمان کو کسی دوسرے کا روپ دھارنے کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ مسیحی ممالک کے اسٹیج پر ایک ایکٹر بے دھڑک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا روپ دھار کر اپنے آپ کو پیش کر دے گا۔ مگر مسلمان ایکٹر ایسی جسارت

ہر گز نہ کرے گا۔ بہروپ والی اداکاری اسلامی تہذیب میں جڑ نہ پکڑ سکی۔ جن تہذیبوں میں خدا کے اوتار کی کہانی مقبول ہے، ان میں اسٹیج کے فن کو گویا ان کے معبود کی تائید میسّر ہے۔

جمہوریت بھی مسیحیوں نے قدیم یونان سے سیکھی۔ اس کی مشق پروٹسٹنٹ کلیسیاؤں کی تنظیم سے ہوئی جن میں باقاعدہ الیکشن کے اصولوں سے گرجا گھروں کے رکھوالے چنے جاتے تھے۔ محلّے محلّے میں گرجا گھر موجود تھے۔ ان کی تنظیم سے عوام کے ذہن الیکشن سے آشنا ہوئے۔ یوں یورپ کی سیاست میں جمہوریت نے زور پکڑا اور صنعتی انقلاب نے اس رجحان کو آگے بڑھایا۔

خلاصہ کلام

مسیحیت کے ادوار کی تقسیم یوں کی جا سکتی ہے کہ پہلے یسوع کی حیات، پھر اس کے بعد اس کے رسولوں کی تبلیغی سرگرمیاں۔ اس ابتدائی زمانے میں کلیسیا کو رومن حکومت کی سرپرستی حاصل نہ تھی اور مسیحی جماعتیں زیرِ عتاب تھیں۔ دوسرا دور کانس ٹن ٹائن (رومن شہنشاہ) کے زمانۂ حکومت سے شروع ہوتا ہے، جس میں اس شہنشاہ کی تدبیر سے ایک مسیحی کونسل کا انعقاد ہوا۔ اس کونسل میں مسیحی کلمۂ شہادت مرتب ہوا۔ چھٹی صدی میں جرمن اور کیلٹک اقوام کے قبول مسیحیت کا آغاز ہوا، اور مسیحی ملّت میں یورپی اور ایشیائی (سریانی) مسلک کی تقسیم رونما ہوئی۔ مزید دو سو سال بعد شرق و غرب میں مسیحیت نے خانقاہی اور راہبانہ رنگ اختیار کر لیا۔ بارہویں صدی میں یونان و روما کے علوم کا احیاء ہوا۔ علم الکلام نے خانقاہی وجدان کو شکست دی۔ تین سو سال مزید گزرے تو پاپائیِ روم کے جبر و غرور کے خلاف احتجاج اٹھے اور رومن کیتھولک کلیسیا اور احتجاجی پروٹسٹنٹ کی تفریق پیدا ہو گئی۔

اسی زمانے میں ایشیا اور افریقہ کے دُور دراز ممالک سے رابطہ جوڑنے، پھر انہیں فتح کرنے کی امنگ اٹھی۔ سائنس کے انکشافات کی چہل پہل ہوئی۔ وہی مسیحی ملّت جو ابتداء میں زیردست تھی، سب سے طاقتور اور مالدار ملّت بن کر دنیا پر مسلط ہوئی۔ دو سو سال ایشیا اور افریقہ پر حکمران رہی۔ صدیوں اس کی ملّت اسلامیہ سے ٹھنی رہی اور بیسویں صدی میں اس کا تصادم روس کی اشتراکی حکومت سے ہوا۔

جنگِ عظیم دوم کے آخر میں مسیحیت کے نمائندوں نے جاپان پر دو ایٹم بم پھینک کر تاریخِ عالم کے ایک نئے دور کا دروازہ کھول دیا۔ یورپی موجدوں کی کرشماتی سائنسی ایجادات سے ایشیا اور افریقہ کی غیر مسیحی اقوام بھی متاثر بلکہ مرعوب ہوئیں، مگر جاپان ٹیکنالوجی کے میدان میں مشرقی اقوام کا نابغہ بن کر ابھر آیا۔ یہ مثال تمام غیر مسیحی اقوام کے لیے مشعلِ راہ بن گئی۔ جاپان کی ثقافت مسیحی نہیں ہے۔ مسیحی دنیا مضطرب ہے کہ دیکھیے جاپان اور کوریا کے بعد اب کون سی ایشیائی اور افریقی اقوام اس میدان میں اترتی ہیں۔

اسلامی ثقافت کے روحانی عناصر

مسیحی کلچر کی طرح اسلامی کلچر بھی بین الاقوامی عوامل سے مربوط ہوا اور "اغیار" سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اسلامی اصطلاح میں "اہل الکتاب" (یہودی اور مسیحی) ایک طرف پیام الٰہی پانے والے اور دوسری طرف گمراہ سمجھے گئے۔ البتہ "اہل الکتاب" کے زمرے سے باہر کے لوگوں کو "اہلِ جاہلیت" کہا گیا۔

اسلام کا آغاز دنیا کے با اثر مذاہب میں سب سے آخر میں ہوا۔ قرآن میں ہندوستان، چین یونان اور روم کے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کا کوئی واضح ذکر نہیں، البتہ یہودیوں کو پیام الٰہی میں تحریف کا مرتکب قرار دیا گیا اور مسیحیوں کے تین عقاید کی قرآن میں صریحاً تردید کی گئی، اوّل یہ کہ خدا فرزند رکھتا ہے، دوم یہ کہ یسوع نے صلیب پر جان دی، سوم یہ کہ خدائے واحد کے تین رُوپ ہیں۔

مسلمان روزانہ پانچ وقت کی نمازوں میں آلِ ابراہیم علیہ السلام اور آلِ محمد ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ گویا آنحضرت ﷺ کی نبوّت انبیاء بنی اسرائیل کے سلسلۂ نبوّت سے براہِ راست منسلک ہے۔ خود آنحضرت ﷺ کے مطابق اُن ﷺ کا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملتا ہے۔ یہودی اور مسیحی محققین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ آلِ اسمٰعیل علیہ السلام میں سے ہیں، لیکن یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ عبرانی کے بجائے عربی بولنے والا کوئی نبی بھی آسکتا ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق آخری نبی ملاکائی تھا جس کا عہد ۴۵۰ ق - م کے لگ بھگ ہے، اور مسیحیوں کے عقیدے کے مطابق یوحنا آخری نبی تھا جو یسوع مسیح کا ہم عصر تھا۔ اس کی شہادت کے بعد نبی آنے بند ہو گئے۔ مسلمانوں کے عقیدے میں عہدِ نبوّت کی صدیاں خود آنحضرت ﷺ کے وصال پر ختم ہوئیں۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں عربی بولنے والا نبی ایک ہی پیدا ہوا محمد ﷺ ابن عبداللہ۔ قرآن بھی عربی میں اترا اور اس نے ثابت کر دیا کہ محض عبرانی بولنے والے ہی نبوّت کے اجارہ دار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

آج میں نے تمھارے دین کو مکمل کر دیا۔ (المائدہ:۵)

اس اعلان کو سن کر مسلمانوں کے دل میں یہ بات اتر گئی کہ اسلام سے پہلے اہل الکتاب کا جو دین موجود تھا، اس میں ارتقاء کی گنجایش اور تکمیل کی ضرورت تھی۔

اسلام کا آغاز شمالی عرب سے ہوا اور آنحضرت ﷺ کے وصال کے فوراً بعد یہ اقصائے عالم میں پھیل گیا۔ عربی زبان جو نزولِ قرآن سے قبل محض بدوی قبایل کی بولی تھی، نزول قرآن کے بعد صرف

دو صدیوں میں یونانی اور لاطینی ادبیات کا مقابلہ کرنے لگی۔ اللہ کے پیغام اور اس کے عربی پیغمبر پر ایمان لاکر محمد ﷺ کے اہل وطن متمدّن ہو گئے۔ مسیحیت نے تو بگڑے ہوئے تمدّن کے فاسد مادّے کو خارج کرنے سے کام کا آغاز کیا تھا، جبکہ اسلام نے ایک نئے تمدّن کی تاسیس کی۔ اس فرق سے مسیحیوں اور مسلمانوں کی روحانیت کے مزاج کا تعیّن کیا جا سکتا ہے۔

جب ہجری تقویم کا آغاز ۶۲۲ء سے ہوا تو یونان و روما کی تہذیبیں اپنے عروج و زوال سے گزر چکی تھیں۔ بائبل کے متن کی تدوین مکمل ہو چکی تھی۔ یہودی، مسیحی اور زرتشتی نظامِ فکر اپنی پختگی کو پہنچ چکے تھے، رومن شہنشاہ مسیحیت قبول کر چکے تھے اور ہندوستان و چین میں بھی تمدّن کے زرّیں زمانے آ چکے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں عربی بولنے والے ایک امّی نبی کا ظہور شمالی عرب میں اس مشیّت الٰہی کا مظہر ہے کہ ایک نئے تمدّن کی تاسیس ہو۔

مسیحیوں نے بنی اسرائیل کے دین کو اصطباغ کے دین میں تبدیل کر کے ایک تبلیغی تحریک بنایا اور عالمی تہذیب کا دروازہ کھولا۔ مسلمانوں نے بھی دینِ ابراہیمی کو تبلیغ کے ذریعے سے دنیا کے سامنے پیش کیا اور مسیحی تہذیب کے دوش بدوش ایک دوسری عالمی تہذیب ظہور پذیر ہوئی۔ مسیحیوں اور مسلمانوں نے یہود کے برعکس تبلیغ کی راہ سے بیگانوں کو یگانگت کی دعوت دی۔ اسی فرق کی وجہ سے مسیحی اور مسلمان پھیل گئے اور یہودی ملّت دنیا میں اقلیّت ہو کر رہ گئی۔

قرآن کا درس ستم اٹھانے کی دعوت کا درس نہیں، مقابلے اور دفاع کا درس ہے۔ عہدِ عتیق کے تاریخی قصّے بنی اسرائیل کی ستم کشی کے قصّے تھے اور مسیحی ملّت کے بانی اور معبود نے بھی صلیب پر جان دے کر ستم کشی کو روحانیات میں مرکزی حیثیت دی۔ لیکن قرآن کی گونج ابتلاء اور اُداسی کی نہیں، فتح اور حوصلے کی گونج ہے۔ سیرت رسول ﷺ کا درس کامرانی کا درس ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے احوال شکست کے نہیں، اہل یثرب کی طرف سے مرحبا کے احوال تھے۔ آٹھ سال کے اندر اندر اُنہیں فوزِ عظیم نصیب ہوئی اور آنحضرت اپنے مولد مکّہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ فتح مکّہ کے بعد رسول عربی ﷺ نے اپنے آپ کو بادشاہ کہا، نہ اپنے لیے کوئی قصر تعمیر کروایا۔ بوریا نشینی اور خاک نشینی بدستور قائم رکھی۔ اُسوۂ حسنہ، یعنی سیرت النبی ﷺ کی روشنی، قرآن کریم کی روشنی سے الگ نہیں۔ قرآن کا لہجہ واشگاف ہے تو سیرت محمدی ﷺ بھی منافقت سے پاک ہے۔ اسلام میں فطری خواہشات کا احترام پایا جاتا ہے۔ اس احترام کا سبق یوں ملتا ہے کہ

> پس دین کے لیے سیدھا اور درست رکھ اپنا رُخ اُس فطرت کے مطابق جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کی بنائی ہوئی فطرت کا بدلنا نہیں چلے گا۔ یہی ہے درست دین، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (الرّوم: ۳۰)

چالیس برس کے سن میں آنحضرت پر پہلی وحی اتری۔ یوحنا نبی کے چھ سو سال بعد ایک عربی

رسول کا دعوائے نبوّت یہودیوں اور مسیحیوں کی نظر میں تو غلط تھا ہی، لیکن خود شمالی عرب کے بت پرست قبایل نے بھی اس جرأت کو جسارت ہی سمجھا اور لڑنے پر تل گئے۔ یہ مخالفت بیس سال سے زائد عرصہ تک جاری رہنے کے بعد آنحضرت ﷺ کے وصال سے دو سال قبل فتح مکّہ پر فرو ہوئی۔ اعجاز آیات قرآنی اور اعجاز سیرت نبوی ﷺ دونوں نے مل کر دلوں کو جیت لیا۔ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور دیگر صحابہؓ کا قبول اسلام ہی کیا کم تھا کہ ہجرت سے پہلے یثرب کے بہت سے مقتدر سردار مکّہ آ کر ان کی نبوت پر ایمان لے آئے اور بیعت سے مشرّف ہوئے۔ یثرب کا مدینتہ النبی ﷺ بن جانا ایسی غیبی تائید تھی جس سے حالات مساعد ہوئے اور نئی اخوّت پروان چڑھ کر اور تنظیم کے مراحل سے گزر کر ایک ایسی ملّت بن گئی جس نے اہل مکّہ کے غرور کو توڑ دیا۔ فتح مکّہ کے وقت نزولِ وحی کا سلسلہ بھی اپنی تکمیل کے قریب پہنچا۔ ہجرت کے ساڑھے سولہ ماہ بعد بیت المقدس کے بجائے نمازیوں کا قبلہ مکّہ قرار پایا۔ یوں ملّت اسلامیہ کا پورا امتیاز ظہور میں آیا۔

حیات محمدی ﷺ بھرپور زندگی ہے۔ مخالفت، پیکار اور سیاسی بخار کے حالات میں گھر کر بھی آپ پیکر محبّت اور مجسمہ حلم تھے۔ ان محاسن سے لوگوں کے دل نرم ہوئے اور بغیر خونریزی کے فتح مکّہ کا انجام پاجانا ممکن اور باعث خیر ہوا۔ عفوو درگزر کے مظاہر سے انتقام کے بگولے رُک گئے۔

محمد ﷺ کی حکمت عملی ہدایت الٰہی کی تابع، شفاف اور بے ریا تھی۔ اُن ﷺ کی ذکاوت میں صفائے قلب شامل تھی اور اُن ﷺ کی سوجھ بوجھ بے خطا تھی، صلح حدیبیہ کے وقت جو شرائط اُنہوں نے لکھوائیں، یہ اُن کی آئین سازی کی استعداد اور سلجھی ہوئی سیاسی فہم کا آئینہ ہیں۔

سیرت محمدی ﷺ کو جانے بغیر قرآن اور قرآن کو جانے بغیر سیرت محمدی ﷺ کی خوبیاں سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ قرآن کی آیات کو اشعار نہیں کہہ سکتے لیکن ان کی صوتی تاثیر سے اللہ تعالیٰ کی جمال پسندی اسی طرح عیاں ہے جیسے اس کے پیدا کیے ہوئے شگوفوں اور پھولوں سے۔ بالخصوص مکّی صورتوں میں قافیہ اور تناسبِ اصوات کے ساتھ لے کاری کی لطافتیں بھی موجود ہیں۔ لیکن دراصل کلام کی آواز حسنِ معانی اور حسنِ اصوات دونوں سے خوشنما و خوش آیند ہوتی ہے۔

قرآن میں جہاں خَلَقنا، آتَینا اور جَعَلنا کے الفاظ اللہ تعالیٰ اپنے لیے لاتا ہے، آیات کے کلام الٰہی ہونے کی یاددہانی ان سے بہ تاکید ہوجاتی ہے۔ خدائے واحد کا اپنے لیے صیغہ جمع متکلّم استعمال کرنا ایک خاص شان رکھتا ہے۔ عدلِ الٰہی کے مضمون کی گونج قرآن میں بلند ہے، عفوِ الٰہی اور مغفرت کی شرط توبہ ہے، نجات، عقبیٰ اور یوم قیامت کے باب میں بھی اعلانات ہوئے ہیں۔

> کیا نہ دی گئی موسیٰ علیہ السلام اور اپنے قول پر پورا اترنے والے ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں
> یہ خبر کہ نہ اٹھائے گا کوئی اٹھانے والا، بوجھ دوسرے کا۔ (النجم: ۳۷-۳۸)
> پس جو کوئی کرے گا ذرّہ بھر بھلائی، اس کو دیکھے گا اور جو کوئی کرے گا ذرّہ بھر بُرائی اس کو

دیکھے گا۔ (الزلزال: ۷-۸)

نہیں کوئی سفارش کرنے والا مگر اس کی اجازت کے بعد--- (یونس: ۳)

یہ اعلان سن کر قرآن کو ماننے والوں کا بھروسہ محمد ﷺ کی شفاعت پر ہے۔

عفو، خیرات اور عفت کی قرآن میں تاکید ہے۔ آیۂ حجاب نے اسلامی ثقافت کو ایک خاص رنگ میں رنگا ہے۔ قرآن میں تعدّدِ ازدواج کی اجازت اس آیت میں ہے۔

پس نکاح کرو جو اچھی لگے تم کو عورتوں سے، دو دو اور تین تین اور چار چار، پس اگر ڈرو تم کہ عدل نہ ہوگا تم سے تو بس ایک ہی۔ یا جس کے مالک ہوئے تمہارے داہنے ہاتھ۔ یہی تمہارے لیے مناسب ترین ہے کہ بے انصافی نہ کرو۔ (النساء: ۳)

شراب کی تحریم کا بھی اسلامی ثقافت پر خاص اثر ہے۔

سوال کرتے ہیں تجھ سے شراب اور جوئے کے بارے میں، کہہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ (البقرہ: ۲۱۹)

آنحضرت ﷺ کے وصال کے فوراً بعد خلافتِ راشدہ کا دور شروع ہوا۔ دین اسلام کی تحریک اس زمانے میں فتوحات کے باوجود پُر آشوب تھی۔ حضرت عمرؓ ایک پارسی کے ہاتھوں مقتول ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کو باغیوں نے قتل کیا اور حضرت علیؓ کو ایک خارجی نے۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے عہد کو پُرامن کہنا ٹھیک نہیں۔

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد حضرت علیؓ نے اپنے حامیوں کے اصرار پر انہیں بیعت سے نوازا۔ حضرت امیر معاویہؓ ان کے مدمقابل ہوئے۔ امیر معاویہؓ سیاسی حالات کی جانچ میں ہشیار تھے۔ انہوں نے جنگ صفین میں سیاست کا پیچ لڑایا، اور خلافت کا مسئلہ ایک کمیٹی کے سپرد کروایا۔ جب کمیٹی کا فیصلہ حضرت معاویہؓ کے حق میں ہوا تو حضرت علیؓ کے بہت سے حمایتی بگڑ گئے اور یہ چلاّتے ہوئے بھاگ نکلے کہ تُف ہے ہم تمہارے لیے سر کٹوانے کو تیار تھے، مگر تم نے اپنی خلافت کا بیڑا ڈبو دیا۔ یہ باغی خارجی کہلائے۔ حضرت علیؓ کا قاتل ابن ملجم انہی میں سے تھا۔ بنواُمیہ کا دورِ خلافت اسّی سال سے زائد نہ رہا۔

جنگِ قادسیہ میں عربوں کی فتح اور آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی شکست کا صدمہ ایرانیوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ دین زرتشت ساسانیوں اور ان کی رعیت کا دین تھا۔ زرتشتی آتش پرست اور ان کے عبادت خانے آتش کدے تھے۔ آتش کدوں کے رکھوالے مُغ کہلاتے تھے۔ اسلام کی آمد سے آتش کدے ویران ہوئے اور مساجد تعمیر ہوئیں۔ ساسانی زمانے اور زرتشتی رسوم کو یاد کر کر کے آہیں بھرنے والے ایرانی وطن پرست تہ خانوں میں بیٹھ بیٹھ کر عربوں کے تسلّط پر خفیہ سرگوشیاں کرنے

کے سوا کسی کام کے نہ رہے۔ شراب کی تحریم نے مے خانوں کو بھی تہ خانوں میں منتقل کر دیا۔ مُغ کا لفظ جو آتش کدہ کے پروہت کے لیے استعمال ہوتا تھا، اب مزاحاً ساقی کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ تہ خانوں میں سازشوں کی باتیں ہونے لگیں۔ ایرانیوں نے عربوں کی سیاست کا بغور مشاہدہ کیا تو انہیں عربوں سے بدلہ لینے کی کوئی فوری تدبیر نظر نہ آئی، البتہ اہلِ بیت کی حمایت کرنے میں بنواُمیہ کے خلاف بغاوت بھڑکانے کی ایک صورت دکھائی دی۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے گھرانے کو خلافت کا خواب دکھایا، اس سازش میں ان کو کامیابی ہوئی۔ بنوعباس کے دور میں ایرانی، اسلامی سیاست میں دخیل ہوئے اور اسلامی خیالات میں عجمی افکار غالب نظر آئے۔

عباسی دور کی ابتداء میں ایرانی شعور میں شیعی اور زرتشتی جذبات کی ملاوٹ خفیہ رہی۔ تشیّع سے ایرانیوں کا کھلم کھلا تعلق کئی صدیوں بعد صفوی دور میں قائم ہوا اور ایرانیوں نے تصوّف کے فروغ کے سامان کیے۔ چونکہ عربوں سے رشتہ داری کی کوئی صورت نکالے بغیر بات بنتی نظر نہ آئی تھی۔ چنانچہ ایران میں یہ مشہور کیا گیا کہ آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی ایک بیٹی امام حسین سے بیاہی گئی تھی۔ تاہم ایران سے باہر یہ روایت مشہور نہ ہو سکی۔

ساسانیوں کی شکست کا صدمہ ایرانیوں کو صدیوں تک رہا۔ اور زرتشتی مذہب کی عظمت کا قصیدہ ایک سرگوشی بن کر ایران میں زندہ رہا۔ فردوسی کو ایک ہزار سال تک خدائے سخن کی حیثیت حاصل رہی کہ وہ قبلِ اسلام کی شہنشاہی کا مدح خوان تھا۔ لیکن ایرانیوں کا تحت الشعور یہ بھی تسلیم کرتا رہا کہ اسلام کی آمد سے ان کا کلچر گل و گلزار ہوا۔ پہلوی زبان کی جگہ فارسی زبان نے لے لی جو عربی رسم الخط میں لکھی گئی۔ فارسی اور عربی کا امتزاج ایک عجیب موسیقیت رکھتا ہے۔ عربی لغت کا تمام سرمایہ فارسی نظم و نثر لکھنے والوں اور فارسی خطیبوں کو میسر آیا۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانے میں عباسی دربار میں ایرانی اثر قوی ہو چکا تھا۔ عباسی خلافت اپنے آغاز سے دو سو سال بعد کمزور ہونے لگی تھی۔ اسلامی دنیا کی سرحدیں اتنی دور دور تک پہنچ چکی تھیں کہ ان پر قابو رکھنا ممکن نہ رہا۔ دور دراز اقالیم میں گورنروں کا تقرّر خلفاء کا اپنے ہاتھ میں رکھنا آسان نہ رہا تو جگہ جگہ بادشاہی خاندان نمودار ہو گئے۔ ان خاندانوں کے مقتدر سربراہ سلطان کہلائے۔ یہ سلاطین خلیفہ کو اپنی تخت نشینی کی اطلاع دے کر اس سے نمائندگیٔ خلافت کی سند حاصل کر لیتے تاکہ مسلمان رعایا ان کی وفادار رہے۔ ان میں سب سے زور آور سلطان محمود غزنوی تھا۔ محمود کی فوج کشی سے پنجاب اور ایران اس کی سلطنت میں شامل ہوئے۔ سو سال بعد ترکوں کا غلبہ ہوا۔ وسطی ایشیا میں سلجوقیوں نے اپنی دھاک بٹھائی۔ تیمور کے جانشینوں نے دو شاندار سلطنتیں قائم کیں، ایک ایران میں، دوسری ہندوستان میں۔ مغلوں کی سلطنت کے متوازی، ایشیائے کوچک میں عثمانی سلطنت قائم ہو گئی جس کے سلاطین نے خلافت کا دعویٰ کیا۔ پہلی بار خلیفۃ الرّسول کا منصب ایک غیر عرب خاندان میں منتقل ہوا اور عرب ان کو امیر المومنین کہنے پر مجبور ہوئے۔ عربوں نے

عثمانی تسلط سے آزادی بیسویں صدی میں انگریزوں کی مدد سے حاصل کی۔ ہندوستان کے مغل سلاطین عثمانیوں سے رقابت رکھتے تھے۔ مغل ہر چند کہ سنّی تھے لیکن ان کے تعلقات ایران کے صفوی (شیعی) خاندان سے خوشگوار تھے۔ مغل خاندان کے دوسرے بادشاہ ہمایوں نے سُوریوں سے شکست کھا کر ایران میں پناہ لی اور پانچ سال بعد صفوی بادشاہ کی اعانت سے سوریوں کو شکست دے کر اپنا تخت واپس لیا۔ مغلوں کے تسنّن میں تشیّع کی آمیزش ہے۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے مسلمانوں کو عثمانی خلافت سے لگاؤ پیدا ہوا۔ جب سلطان عبدالحمید پہلی عالمی جنگ کے بعد معزول ہوا تو اس کے ماتم سے ہندوستان میں ایک کہرام بپا ہو گیا، البتہ عربوں کو اس خاندان کے اختتام سے کوئی افسوس نہ ہوا۔

شمالی افریقہ میں فاطمی خلافت عباسی دور میں ایک حریف کی شان سے قائم ہوئی۔ یہاں طبّاعی اور آزادیٔ فکر کے جو کرشمے ظہور پذیر ہوئے، ان سے اسلامی تہذیب کو چار چاند لگ گئے۔ ابن عربی، ابن خلدون اور ابن حزم وہیں کی کہکشاں کے ستارے ہیں۔

عربوں کا تسلط عربستان سے باہر دو ڈھائی سو سال بعد ختم ہو گیا، لیکن اپنے دین کے منبع یعنی عرب سے اسلامی ملکوں کا تعلق گہرا اور مسلسل رہا۔ فارسی، ترکی اور اُردو کے لیے عربی رسم الخط اختیار کیا گیا۔ شمالی افریقہ کے متعدّد ملکوں میں عربی بول چال نے اپنا سکّہ جمایا۔ انڈونیشیا تک عربی بولی گئی۔ قرآن مجید کے نسخے ہر گھر میں موجود ہوئے۔ عربی رسم الخط کی خطاطی سے اسلامی دنیا کے در و بام مزیّن ہوئے۔ اذان کی گونج سے اطراف عالم میں عربی زبان بھی گونجی۔ قبلہ رو ہو کر نماز ادا کرنے اور حج کے لیے قصد حرمین سے اسلامی دنیا میں عرب کی مرکزی حیثیت برقرار رہی۔

ہندوستان کے سلاطین کے درباروں میں فارسی زبان کا بول بالا ہوا تو اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی ثقافت میں بھی عجمی مسالہ پڑا۔ عجمی تصوّف عجمی تشیّع کا مرہون منت ہے۔ تشیّع اور تصوّف ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ تصوّف کی ترقی شیعی مذہب کے اصولِ تقیّہ کی وجہ سے لازم تھی۔ تصوّف کے درمیان میں آجانے سے تسنّن اور تشیّع کے ٹکراؤ میں سختی نہ رہی، اور شیعہ اقلیّت کے بچاؤ میں سہولت ہوئی۔ ایرانی تاریخ کے خصوصی تقاضوں سے ایرانیوں نے تشیّع کو اپنا کر اسلام کی عجمی ثقافت میں ایک رچاؤ پیدا کیا۔ تشیّع کے بغیر عجمی ثقافت کا تصوّر ناممکن ہے۔ شیعی امام باڑوں کی فضا سنّی مساجد سے مختلف ہوتی ہے۔ اسمہ اور ان کے حمایتیوں پر جو گزری، اس کی یاد سے امام باڑے کے اندر سوز و گداز اور احتجاج کی آمیزش ہوئی۔ مستحقوں کی حق تلفی کرنے والوں پر ناراضی ہر چہرے سے جھلکتی ہے۔ پھر جب سوز خوانی ہونے لگتی ہے تو گریہ و اشک باری میں سب حاضرین و حاضرات شریک ہو جاتے ہیں۔

امام باڑوں کا سا گریہ مسیحی عبادت خانوں میں کبھی نہ ہوا، حالانکہ یسوع کے مصلوب ہونے کی روداد بھی المناک ہے۔ مسیحی لوگوں کے عقیدے میں صلیب کی کہانی کا انجام یسوع کی موت نہیں، اس

کی موت کے بعد اس کا معراج ہے۔

اسلامی تنظیم کی اساس شریعت ہے، مسیحی تنظیم کی اساس شریعت شکنی - یسوع شریعت شکن تھا یا نہیں، اس پر مسیحی مؤرخ متفق نہیں ہیں، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ یسوع شریعت شکنی ہی کے الزام میں گرفتار ہو کر مصلوب ہوا۔ مسیحی معاشرے میں فقہ جو شریعت کی شرح کا فن ہے پنپ نہ سکا۔

اسلامی تاریخ میں شریعت پہلے آئی اور طریقت بعد میں۔ صوفیاء تو کہیں گے، نہیں جی، طریقت کے عناصر قرآن میں موجود ہیں۔ غیر جانب دار رائے کو اس سے اتفاق نہ ہو گا۔ جب فقہ اور کلام کی موشگافیاں حد اعتدال سے بڑھ گئیں تو طریقت کی ضرورت پیش آئی۔ رواں صورت حال سے بچنے والوں کو صوفیاء نے خانقاہوں کے گوشہ ہائے عافیت مہیا کیے۔ مسجد میں اللہ، محمد ﷺ، انبیاء علیہم السلام اور قرآن کے ذکر میں جو احتیاطیں تھیں، وہ خانقاہ میں آکر نرم ہو گئیں۔ قوالی میں اللہ اور اس کے محبوب رسول ﷺ سے پیار یا شکایت کی بات بے تکلفی سے کہنا ممکن ہوا۔ سازہائے موسیقی جن کا مسجد کے اندر لانا ہمیشہ قطعاً ممنوع رہا، خانقاہ میں ان کے داخلے کی اجازت دی گئی۔ اقبال نے تصوّف کو مسلمانوں کے انحطاط کی وجہ قرار دیا لیکن شیخ احمد سرہندی اور مولانائے روم سے ان کو بے پناہ عقیدت تھی۔ اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ اقبال کے مزاج کے رچاؤ میں ذوقِ تصوّف کا حصّہ بھی ضرور ہے۔

سیاسی اقدار میں مسلمانوں کے تردّد بہت ہیں۔ خلافت تو جاتی رہی۔ اس کے احیاء کا نعرہ نہ ترکوں کی طرف سے تھا، نہ عربوں کی طرف سے، صرف ہندوستان میں چند سال بلند ہوا پھر بند ہو گیا۔ لیکن دنیا کی سیاست کی جو صورت ہو گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ سلطانی جو مسلمانوں کے مزاج کا خاصّہ بن چکی تھی، اب دوبارہ اپنی پرانی شان سے واپس نہ آسکے گی۔ بادشاہی اب رہی کہاں؟ ہندوستان کے مسلمان بھی انگریزی دور میں بادشاہی سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد حیدر آباد کا رئیس (نظام دکن) اور امیر کابل ہی سلطانی ثقافت کی نمائندگی کو رہ گئے۔ اقبال کو ان دونوں سے لگاؤ تھا۔ جمہوریت کی آمد سے اقبال واقعی خوش تھے یا نہیں۔ ہم بتا نہیں سکتے۔ ان کا تردّد اس مصرع سے ظاہر ہے۔

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ

اقبال کا تحت الشعور اس مصرع میں جھلک رہا ہے۔ وہ جمہوریت کو بھی کسی سلطانی رنگ ہی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اقبال ہی پر منحصر نہیں، ممالک اسلام کے بہت سے باشندوں کا تحت الشعور یہی چاہتا ہے۔

****